خوابِ گُل پریشاں ہے

احمد فراز

خوابِ گُل پریشاں ہے

احمد فراز

KHUAB-E-GUL PARESHAN HAI

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-19-6

Price. Rs. 80/=

نام کتاب — خواب گل پریشاں ہے

مصنف.. — ..احمد فراز

سن اشاعت — ...۲۰۰۲ء

قیمت — ...۸۰روپے

مطبع. — .کاک پرنٹرس، دہلی

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E -mail kitabiduniya@rediffmail.com

حمید اخوند

کے نام

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، بر سرِ عام رکھ دیا

ترتیب

ب

ج

د

احمد فراز کی شاعری۔۔۔ایک مختصر تاثر

چند ہفتے پہلے کا واقعہ ہے کہ احمد فراز، امجد اسلام امجد، سجاد بابر اور میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھے مکہ مکرمہ پہنچے۔ ہم طواف کعبہ مکمل کر چکے اور سعی کے لیے صفا و مروہ کا رخ کرنے والے تھے کہ ایک خاتون لپک کر آئی اور احمد فراز کو بصد شوق مخاطب کیا۔ "آپ احمد فراز صاحب ہیں نا؟" فراز نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ "ذرا اسار کیے گا۔ میرے بابا جان کو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔" وہ گئی اور نہایت بوڑھے بزرگ کا بازو تھامے انہیں فراز کے سامنے لے آئی۔ بزرگ اتنے معمر تھے کہ بہت دشواری سے چل رہے تھے مگر ان کا چہرہ عقیدت کے مارے سرخ ہو رہا تھا اور ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بولے۔ "سبحان اللہ۔ یہ کتنا بڑا کرم ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے ہی گھر میں مجھے احمد فراز صاحب سے ملوا دیا۔۔۔وہ احمد فراز جو میرے محبوب شاعر ہیں اور جنہوں نے میر و غالب کی روایت کو توانائی بخشی ہے۔" عقیدت کے سلسلے میں انہوں نے اور بہت کچھ کہا۔ جب ہم ان سے اجازت لے کر سعی کے لیے بڑھے تو میں نے فراز سے کہا۔ "آج آپ کی شاعری پر سب سے بڑے الزام کا ثبوت مل گیا ہے۔" سب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ "دیکھا نہیں آپ نے۔" یہ "ٹین ایجر" فراز سے کتنی فریفتگی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ٹین ایجر کی عمر اسی پچاسی سے متجاوز تھی۔"

"فراز ٹین ایجر کا شاعر ہے۔۔۔" "فراز صرف عنفوانِ شباب میں داخل ہونے والوں کا شاعر ہے۔" ۔۔۔"فراز کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ کا شاعر ہے اور بس" ۔۔۔فراز پر یہ الزامات ہر طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں مگر وہ اس الزام تراشی سے بے نیاز، نہایت خوب صورت شاعری تخلیق کیے جا رہا ہے۔ اگر حسن و جمال اور عشق و محبت کی اعلیٰ درجے کی شاعری گھٹیا ہوتی تو میر

اور غالب، بلکہ دنیا بھر کے عظیم شاعروں کے ہاں گھٹیا شاعری کے انباروں کے سوا اور کیا ہوتا۔ فراز کی شاعری میں بیشتر یقیناً حسن و عشق ہی کی کارفرمائیاں ہیں اور یہ وہ موضوع ہے جو انسانی زندگی میں سے خارج ہو جائے تو انسانوں کے باطن صحراؤں میں بدل جائیں، مگر فراز تو بھرپور زندگی کا شاعر ہے۔ وہ انسان کے بنیادی جذبوں کے علاوہ اس آشوب کا بھی شاعر ہے جو پوری انسانی زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس نے جہاں انسان کی محرومیوں، مظلومیتوں اور شکستوں کو اپنی غزل و نظم کا موضوع بنایا ہے، وہیں ظلم و جبر کے عناصر اور آمریت و مطلق العنانی پر بھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے اور اس سلسلے میں غزل کا ایسا ایسا شعر کہا ہے اور ایسی ایسی نظم لکھی ہے کہ پڑھتے یا سنتے ہوئے اس کے مداحین جھومتے ہیں اور اس کے معترضین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یہ دونوں پہلو زندگی کی حقیقت کے پہلو ہیں اور حقیقت ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔

ایک بات ایک معروف شاعر نے چند دوسرے ہردلعزیز شعراء کے علاوہ احمد فراز پر بھی تک بندی کا الزام عائد کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شاعر اگر احمد فراز کا سا ایک شعر بھی کہہ لیتے تو اس احساس کمتری کا مظاہرہ کرنے کا تکلف نہ فرماتے۔ مثال کے طور پر فراز کے صرف دو شعر دیکھیے۔ اگر یہ تک بندی ہے تو نہ جانے اعلیٰ معیار کی شاعری کسے کہتے ہیں:

ذکر اس غیرت مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

آج اس نے شرف ہمسفری بخشا تھا
اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہی

میں صرف ان دو شعروں کے حوالے سے کہوں گا کہ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں پوری فارسی اور اردو غزل کی دل آویز روایات گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

احمد فراز کے والد مرحوم اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ پھر فراز کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ کوہاٹ اور پشاور میں اردو شعر و شاعری کا ایک بھرپور ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز

کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے۔ اس کا ایک ایک مصرع ایسا گتھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ اور چونکہ فراز کی غزل تکمیل (PERFECTION) کی انتہا ہے اس لیے جب وہ نظم کہتا ہے، تو اس کی بھی ایک ایک لائن برجستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ چنانچہ احمد فراز غزل اور نظم کا ایسا شاعر ہے جو دور حاضر کے چند گنے چنے معتبر ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔

یہ جو بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ فراز کے ہاں حسن و عشق کی زمیوں کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب کی جو للکار ہے وہ اسے تضادات کا شکار بنا دیتی ہے، تو یہ حضرات اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسن و عشق کی منازل سے گزرے بغیر انقلاب کی للکار اعتماد سے محروم رہتی ہے اور وہی شعراء صحیح انقلابی ہوتے ہیں جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے اندازہ داں ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ فراز کا یہ کمال بھی لائق صد تحسین ہے کہ کڑی آزمائشوں میں سے گزرنے کے باوجود وہ اپنی انقلابی شاعری میں بھی سچا شاعر رہا ہے۔ وہ نعرہ زنی نہیں کرتا، صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کو اپنی سوچ کے مطابق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ صدفی صد درست ہے کہ:

دیکھو تو بیاضِ شعر میری
اک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

فراز کے یہ نام نہاد "تضادات" تو اس کے فن کی توانائی ہیں۔ بصورت دیگر وہ ذات اور کائنات کو ہمرشتہ کیسے کر سکتا تھا اور اس طرح کے شعر کیسے کہہ سکتا تھا کہ:

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

خود آگہی کا یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔

میں فراز کے شاعرانہ کمالات کے اس نہایت مختصر تاثر کے آخر میں اس کی غزل میں تغزل کی اس بھرپور فضا سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہوں جو غزل کی سی لطیف صنفِ سخن کی سچی شناخت ہے۔ یہ صرف چند اشعار ہیں جو اس وقت یادداشت میں تازہ ہیں:

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار، مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے

یہ اس دور کی غزل ہے جس پر احمد فراز نے سالہا سال تک حکمرانی کی ہے اور جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک الگ باب کی متقاضی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

انتساب

ہماری چاہتوں کی بزدلی تھی

ورنہ کیا ہوتا

اگر یہ شوق کے مضموں

وفا کے عہد نامے

اور دلوں کے مرثیے

اک دوسرے کے نام کر دیتے

زیادہ سے زیادہ

چاہتیں بدنام ہو جاتیں

ہماری دوستی کی داستانیں عام ہو جاتیں

تو کیا ہوتا

یہ ہم جو زیست کے ہر عشق میں سچائیاں سوچیں

یہ ہم جن کا اثاثہ تشنگی، تنہائیاں، سوچیں

یہ تحریریں
ہماری آرزومندی کی تحریریں
بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں
فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہوں
یہ تحریریں
اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا
شعر کے مداح
ہم پر تہمتیں دھرتے
ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں
اور یہ افواہیں
کسی پہلی نگارش میں
ہمیشہ کے لیے مرقوم ہو جاتیں
ہماری ہستیاں مذموم ہو جاتیں

نہیں ایسا نہ ہوتا

اور اگر بالفرض ہوتا بھی

تو پھر ہم کیا

سُبک سارانِ شہرِ حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟

سگانِ کوچہ۔ شہرت کے غوغا

کالے بازاروں۔کے دلالوں سے ڈرتے ہیں؟

ہمارے حرف جذبوں کی طرح

سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں

بلا سے ہم اگر مصلوب ہو جاتے

یہ سودا کیا بُرا تھا

گر ہماری قبر کے کتبے

تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے!

○

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کی سیاہ چشمگی قیامت ہے
سو اُس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

2

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اس کی
جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ امکاں میں
پلنگ زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گُلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

○

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

جدائیاں تو مقدر ہیں پھر بھی جانِ سفر
کچھ اور دُور ذرا ساتھ چل کے دیکھتے ہیں

رہِ وفا میں حریفِ خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں

تُو سامنے ہے تو پھر کیوں یقیں نہیں آتا
یہ بار بار جو آنکھوں کو مل کے دیکھتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں موجود تیری محفل میں
جو لالچوں سے تجھے، مجھ کو جل کے دیکھتے ہیں

یہ قُرب کیا ہے کہ یکجاں ہوتے نہ دُور رہے
ہزار ایک ہی قالب میں ڈھل کے دیکھتے ہیں

نہ تجھ کو مات ہوئی ہے نہ مجھ کو مات ہوئی
سو اب کے دونوں ہی چالیں بدل کے دیکھتے ہیں

یہ کون ہے سرِ ساحل کہ ڈوبنے والے
سمندروں کی تہوں سے اچھل کے دیکھتے ہیں

ابھی تلک تو نہ کندن ہوئے نہ راکھ ہوئے
ہم اپنی آگ میں ہر روز جل کے دیکھتے ہیں

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خبر
چلو فراز کو، اے یار چل کے دیکھتے ہیں

○

وہ تفاوتیں ہیں مرے خدا کہ یہ تُو نہیں کوئی اور ہے
کہ تو آسماں پہ ہو تو ہو، پہ سرِ زمیں کوئی اور ہے

وہ جو راستے تھے وفا کے تھے یہ جو منزلیں ہیں سزا کی ہیں
مرا ہمسفر کوئی اور تھا مرا ہمنشیں کوئی اور ہے

مرے جسم و جاں میں ترے سوا نہیں اور کوئی بھی دوسرا
مجھے پھر بھی لگتا ہے اس طرح کہ کہیں کہیں کوئی اور ہے

میں اسیر اپنے غزال کا میں فقیر دشتِ وصال کا
جو ہرن کو باندھ کے لے گیا وہ سبکتگیں کوئی اور ہے

میں عجب مسافرِ بے اماں کہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں
مجھے یہ لگا مرا خاکداں یہ زمیں نہیں کوئی اور ہے

رہے بے خبر مرے یار تک، کبھی اس پہ شک، کبھی اُس پہ شک
میرے جی کو جس کی رہی للک، وہ قمر جبیں کوئی اور ہے

یہ جو چار دن کے ندیم ہیں انہیں کیا فراز کوئی کہے
وہ محبتیں وہ شکایتیں ہمیں جس سے تھیں کوئی اور ہے

To Let

میں تیرے لُطفِ فراواں کا معترف ہوں مگر
حسین و خندہ جبیں میزبان تھی وہ بھی

مطابقت تو نہیں پر مماثلت ہے بہت
تو آسمان سہی سائبان تھی وہ بھی

تو میرے شام و سحر کا خیال رکھتی ہے
تری طرح ہی بہت مہربان تھی وہ بھی

تجھے بھی لوگ بڑی چاہتوں سے دیکھتے ہیں
نگاہِ اہلِ تمنا کی جان تھی وہ بھی

تو ایک حرف و حکایت کے سلسلے کی طرح
طلسمِ ہوشربا داستان تھی وہ بھی

تو لے اڑی ہے مجھے جس طرح نشے کی طرح
جو سچ کہوں تو مزے کی اڑان تھی وہ بھی

میں اپنے گھر کی طرح اس میں بس گیا تو کُھلا
کرائے کے لیے خالی مکان تھی وہ بھی

○

نہ جانے ظرف تھا کم یا انا زیادہ تھی
کلاہ سر سے تو قد سے قبا زیادہ تھی

رمیدگی تھی تو پھر ختم تھا گریز اس پر
سپردگی تھی تو بے انتہا زیادہ تھی

غرور اس کا بھی کچھ تھا جدائیوں کا سبب
کچھ اپنے سر میں بھی شاید ہوا زیادہ تھی

وفا کی بات الگ پر جسے جسے چاہا
کسی میں حسن، کسی میں ادا زیادہ تھی

فراز اس سے وفا مانگتا ہے جاں کے عوض
جو سچ کہیں تو یہ قیمت ذرا زیادہ تھی

○

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

اس کی وہ جانے اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

○

اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں گرم تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اُس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

جو بھی ملا اسی کا دل حلقہ بگوشِ یار تھا
اس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا

اور فراز چاہتیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

وہ شام کیا تھی

وہ شام کیا تھی جب اس نے بڑی محبت سے
کہا کہ تُو نے یہ سوچا بھی ہے کبھی احمد

خدا نے کتنی تجھے نعمتیں عطا کی ہیں
وہ بخششیں کہ ہیں بالا تر از شمار و عدد

یہ خال و خد یہ وجاہت یہ تندرست بدن
گرجتی گونجتی آواز استوار جسد

بسانِ لالہ۔ صحرا تپاں تپاں چہرہ
مثالِ نخلِ کہستاں دراز قامت و قد

اگرچہ نام و نسب کا نہیں ہے تُو قائل
پہ ہیں قبیلہ۔ سادات سے ترے اب و جد

بجائے خود ہنرِ شاعری ہے اک انعام
پھر اس پہ اور شرف ہے قبولیت کی سند

ترے کلام پہ یہ قول صادق آتا ہے
کہ شعر خوب ز دل خیزد و بہ دل ریزد

کبھی غزل سنو تیری تو ایسا لگتا ہے
درونِ نَے چوں دلِ نَے نوازمی نالد

ترا نہالِ سخن بارور ہوا کیا کیا
اگرچہ سایہ کناں تجھ پہ تھے کئی برگد

قبولِ عام نے تجھ کو وہ آبرو بخشی
کہ خلق پیار کرے تجھ سے اور حریف حسد

محبتیں تجھے اتنی ملیں کہ دل میں ترے
نہ دشمنی نہ عداوت نہ ضد نہ بغض نہ کد

تو اپنے عصر میں ممتاز ہے یہی ہے بہت
چراغ کس کا وگرنہ جلا ہے تا بہ ابد

اگر ہو محفلِ خوباں تو جانِ محفل تُو
اگر ہو حلقۂ رنداں تو، تُو سرِ مسند

کبھی ہے رقص کناں نعرہ زن سرِ بازار
کبھی ہے راندۂ دربار صورتِ سرمد

امیرِ شہر کی نظروں میں مفسد و سرکش
خطیبِ شہر کے خطبوں میں کافر و مرتد

کبھی وطن بدری کے عذابِ جاں لیوا
کبھی اسیری و درماندگی کی ساعتِ بد

اگر کریں جو تقابل ترے مصائب کا
زمانہ سخت کم آزار تھا بجانِ اسد

سو یہ بھی ایک ہے اعزاز اہلِ دل کے لیے
سو یہ بھی دین ہے اس کی بہر کسے نہ دہد

نہ تیرے دوش پہ خلعت کوئی کفن کی طرح
نہ تیرے سر پہ ہے دستارِ کبر کا گنبد

سعادت ایست کہ ہرگز بزورِ بازو نیست
"کہ تانہ رحمتِ پروردگار می بخشد"

میں بت بنا رہا سنتا رہا بیانِ صنم
چوں پیش آئنہ رُو آئنہ نفس نہ کشد

وہ خود غزل تھی سو جائز مبالغے اس کے
مگر نہ یوں بھی کہ چھو لیں غلو و کذب کی حد

وہ بولتی گئی جذبات کے بہاؤ میں تھی
وہ کہہ رہی تھی خرد کو جنوں، جنوں کو خرد

جب اس کی ہوش ربا گفتگو تمام ہوئی
تو اس سے میں نے کہا اے قرارِ جان و جسد

میں کب رہا ہوں مگر اس کی ذات سے غافل
کہ جس کی مجھ پہ رہیں مہربانیاں بے حد

یہ رنگ و نقش یہ حرف و نوا یہ صحتِ جاں
یہ شاعری یہ شرف سب اسی کی داد و مدد

یہ فن بہانہ ہے اظہارِ دردِ دل کے لیے
نہ یہ کہ شہرہ و شہرت تھا گوہرِ مقصد

مگر مرے لیے سو بخششوں کی اک بخشش
مری طلب کے بیابان میں تری آمد

ترے ہی طلعت و گیسو کی دھوپ چھاؤں ہے
کہاں کی صبح بنارس کہاں کی شامِ اودھ

تو خود بہار شمائل ہے داد خواہ ترے
گلاب و لالہ و نسریں و نسترن کے سبد

ترا جمال ترا التفات تیری وفا
مرے دیارِ تمنا کی آخری سرحد

مرا وجود مرے خواب میری دولتِ فن
تری ہی نذر ہیں اے جاں اگر قبول افتد

کجاست سنگِ درِ یارِ من کہ دل بہ نہم
بر آستانہ۔ شاہاں فراز پا نہ نہد

(نذرِ جالب)

کب تک درد کے تحفے بانٹو خونِ جگر سوغات کرو
*جالب ھُن گل مک گئی اے"، ھُن جان نوں ہی خیرات کرو

کیسے کیسے دشمنِ جاں اب پرسشِ حال کو آئے ہیں
ان کے بڑے احسان ہیں تم پر اٹھو تسلیمات کرو

تم تو ازل کے دیوانے اور دیوانوں کا شیوہ ہے
اپنے گھر کو آگ لگا کر روشن شہر کی رات کرو

اے بے زور پیارے تم سے کس نے کہا کہ یہ جنگ لڑو
شاہوں کو شہہ دیتے دیتے اپنی بازی مات کرو

اپنے گریباں کے پرچم میں لوگ تمہیں کفنائیں گے
چاہے تم منصور بنو یا پیروی۔ سادات کرو

فیض گیا اب تم بھی چلے تو کون رہے گا مقتل میں
ایک فراز ہے باقی ساتھی، اس کو بھی اپنے ساتھ کرو

○

اک دست شناس نے مجھ سے کہا ترے ہاتھ کی ریکھائیں ہیں عجب
تیرے پاؤں انوکھی بیڑی ہے ترے گلے میں مالائیں ہیں عجب

ترے پیار کے کتنے قصّے ہیں تری ذات کے کتنے حصّے ہیں
کہیں رام ہے تُو کہیں راون ہے، تری پیت کی چرچائیں ہیں عجب

کبھی ندیا جیسے بول کہے کبھی ساگر جیسا شور کرے
ترا بھید بھرا لہجہ نہ کھلے تری ساری کویتائیں ہیں عجب

کئی تجھ کو دنیا دار کہیں کئی لوگ تجھے اوتار کہیں
ترا جیون ناٹک جیسا ہے ترے نام کی لیلائیں ہیں عجب

کبھی پریم کا رس چھڑکاتے تُو کبھی برہا بس ٹپکانے تو
کبھی زہر ہے تُو کبھی امرت ہے ترے دھیان کی گیتائیں ہیں عجب

کوئی گوپی تجھ کو جان کہے کوئی دیوی تجھ پر مان کرے
تو کرشن نہ شام مگر پھر بھی تری رسیا رادھائیں ہیں عجب

تو اک متوالہ پنچھی ہے اس شاخ اڑے اس باک پھرے
کیا ٹھور ٹھکانہ ہو تیرا ترے من کی دنیائیں ہیں عجب

کبھی اوس سے پیاس بجھائے تُو کہیں دریا کو ٹھکرائے تُو
تیرا ہنستا چہرہ اور لگے تری آنکھوں کی برکھائیں ہیں عجب

تو بنجارہ یا جوگی ہے، تو کوی ہے یا کوئی روگی ہے
تو گیانی ہے یا مورکھ ہے ترے بارے میں سب رائیں ہیں عجب

○

اِدھر اک دل اُدھر ساری خدائی
دُہائی ہے خداوندا دُہائی

فقیہوں کی وہی ہذیاں نویسی
خطیبوں کی وہی ہرزہ سرائی

کسی کے سر پہ دستارِ ریا ہے
کسی کے تن پہ دلقِ کبریائی

نہ یہ شائستۂ وصلِ صنم ہیں
نہ وہ سرگشتۂ رسمِ خدائی

ہوئی ہے عام اب صحرا فروشی
بہت ہے ان دنوں دریا نمائی

یہاں اندھے ہیں آئینوں کے گاہک
یہاں گونگوں کو زعمِ خوشنوائی

وفا کیسی کہاں کی دوستداری
جہاں احباب ہوں یوسف کے بھائی

محبت کا صلہ کیا ہے مگر ہاں
ملامت، طعن، تہمت، جگ ہنسائی

خوشی کیا ہے گئی تو عمر بھر کو
گھڑی بھر کے لیے آئی تو آئی

"ق"

دِلا تو کس ڈگر پر چل دیا ہے
یہاں راہی کی منزل نارسائی

گرہ جب بھی پڑی کارِ جنوں میں
خرد کب ناخنِ تدبیر لائی

وہاں بے سود ہے شکوہ شکایت
جہاں وضعِ جہاں ہو کج ادائی

نہیں نوحہ گری تیرا قرینہ
نہیں شیوہ ترا ماتم سرائی

ترا مسلک محبت ہے محبت
بلا سے راس آئی یا نہ آئی

فضا میں اجنبی تاریکیاں ہیں
جلا کوئی چراغِ آشنائی

اٹھا ساغر کہ دنیا چار دن ہے
قیامت کی گھڑی آئی کہ آئی

سجا محفل کہ تیرا ہمنشیں ہے
وہ بُت، چاہے جسے ساری خدائی

سنا ایسی غزل کوئی کہ پیارے
نہیں اب تک کسی مطرب نے گائی

○

بہار آئی تو کیا کیا یاد آئی
تری خوش قامتی لالہ قبائی

تصور نے عجب باندھا ہے نقشہ
تحیّر نے گرہ منہ پر لگائی

نہ کوئی سامنے تھا استعارہ
نہ کوئی ذہن میں تشبیب آئی

فروغِ حسن سے خیرہ تھیں آنکھیں
سو ابرِ زلف نے چلمن گرائی

ودیعت ہے تری جلوہ گری کی
جو حیرت آئنہ خانوں نے پائی

تری آنکھوں کے آگے کب سے نرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ گدائی

نشاطِ وصل سے ہیں تتلیاں مست
دُھلا سبزے سے زنگارِ جدائی

کوئی بھنورا اڑا ہے گنگناتا
کلی نے آنکھ کھولی مسکرائی

عنادل ٹوٹ کر ہیں زمزمہ خواں
گلابوں کا زرِ ناکتخدائی

ہوا اپنی نمی سے آپ بوجھل
فضا رنگوں کی بارش میں نہائی

لگی تھی رنگِ گل سے باغ میں آگ
صبا پاؤں کہیں رکھنے نہ پائی

قصیدہ اک بہارِ ناز کا تھا
سو مثلِ برگِ گل تشبیب آئی

زلیخائے سخن نے مدتوں بعد
قبا کے بند کھولے گنگنائی

غزل میں ہو گیا خونِ جگر صرف
کہاں کی لوح کیسی روشنائی

پرِ طاؤس کی صورت ہے قرطاس
قلم نے مُو قلم کی چھب دکھائی

گریز آساں کہاں جب طبعِ شاعر
ہو سرمستِ مئے نغمہ سرائی

ادھر موزوں طبیعت موج پر ہو
ادھر مضموں ہو تیری دلربائی

کب آیا زنگِ الفت آئینے پر
جمی ہے کب کسی دریا پہ کائی

بہت دن ہو گئے تھے شعر لکھے
نہ آمد تھی نہ فصلِ لب کشائی

غمِ دنیا میں سرگرداں تھے ایسے
نہ دل رویا نہ تیری یاد آئی

تجھے کھویا تو یوں لگتا ہے جیسے
گنوا دی زندگی بھر کی کمائی

ترا احمد فراز اب بھی ترا ہے
کجائی اے نگارِ من کجائی

بھلی سی ایک شکل تھی

بھلے دنوں کی بات ہے
بھلی سی ایک شکل تھی
نہ یہ کہ حسنِ تام ہو
نہ دیکھنے میں عام سی

نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہگزر لگے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے

کوئی بھی رُت ہو اس کی چھب
فضا کا رنگ روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی
وہ سردیوں کی دھوپ تھی

نہ مدتوں جدا رہے
نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتۂ وفا پہ ضد
نہ یہ کہ اذنِ عام ہو

نہ ایسی خوش لباسیاں
کہ سادگی گلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی
کہ آئنہ حیا کرے

نہ اختلاط میں وہ رم
کہ بد مزہ ہوں خواہشیں
نہ اس قدر سپردگی
کہ زچ کریں نوازشیں

نہ عاشقی جنون کی
کہ زندگی عذاب ہو
نہ اسقدر کٹھور پن
کہ دوستی خراب ہو

کبھی تو بات بھی خفی
کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشتِ زعفراں
کبھی اداسیوں کا بن

O

سنا ہے ایک عمر ہے
معاملاتِ دل کی بھی
وصالِ جانفزا تو کیا
فراقِ جانگسل کی بھی

سو ایک روز کیا ہوا
وفا پہ بحث چھڑ گئی
میں عشق کو امر کہوں
وہ میری ضد سے چڑ گئی

میں عشق کا اسیر تھا
وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو
وہ بدتر از ہوس کہے

"شجر حجر نہیں کہ ہم
ہمیشہ پا بہ گِل رہیں
نہ ڈھور ہیں کہ رسیاں
گلے میں مستقل رہیں

محبتوں کی وسعتیں
ہمارے دست و پا میں ہیں
بس ایک در سے نسبتیں
سگانِ باوفا میں ہیں

میں کوئی پینٹنگ نہیں
کہ اک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہو
اسی کے پریم میں رہوں

تمہاری سوچ جو بھی ہو
میں اس مزاج کی نہیں
مجھے وفا سے بیر ہے
یہ بات آج کی نہیں"

نہ اس کو مجھ پہ مان تھا
نہ مجھ کو اس پہ زعم ہی
جو عہد ہی کوئی نہ ہو
تو کیا غمِ شکستگی

سو اپنا اپنا راستہ
ہنسی خوشی بدل دیا
وہ اپنی راہ چل پڑی
میں اپنی راہ چل دیا

بھلی سی ایک شکل تھی
بھلی سی اس کی دوستی
اب اس کی یاد رات دن
نہیں، مگر کبھی کبھی

○

آنکھوں میں ستارے تو کئی شام سے اترے
پر دل کی اداسی نہ در و بام سے اترے

کچھ رنگ تو ابھرے تری گل پیرہنی کا
کچھ زنگ تو آئینۂ ایام سے اترے

ہوتے رہے دل لمحہ بہ لمحہ تہہ و بالا
وہ زینہ بہ زینہ بڑے آرام سے اترے

جب تک ترے قدموں میں فرو کش ہیں سبو کش
ساقی خطِ بادہ نہ لبِ جام سے اترے

بے طمع نوازش بھی نہیں سنگدلوں کی
شائد وہ مرے گھر بھی کسی کام سے اترے

اوروں کے قصیدے فقط آورد تھے جاناں
جو تجھ پہ کہے شعر وہ الہام سے اترے

اے جانِ فراز اے مرے ہر دکھ کے مسیحا
ہر زہر زمانے کا ترے نام سے اترے

○

ساقیا ایک نظر جام سے پہلے پہلے
ہم کو جانا ہے کہیں شام سے پہلے پہلے

نو گرفتارِ وفا، سعیِ رہائی ہے عبث
ہم بھی الجھے تھے بہت دام سے پہلے پہلے

خوش ہو اے دل کہ محبت تو نبھا دی تو نے
لوگ اُجڑ جاتے ہیں انجام سے پہلے پہلے

اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے

سامنے عمر پڑی ہے شبِ تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

کتنا اچھا تھا کہ ہم بھی جیا کرتے تھے فراز
غیر معروف سے، گمنام سے، پہلے پہلے

○

دکھ چھپائے ہوئے ہیں ہم دونوں
زخم کھائے ہوئے ہیں ہم دونوں

ایسا لگتا ہے پھر زمانے کو
یاد آئے ہوئے ہیں ہم دونوں

تُو کبھی چاندنی تھی دھوپ تھا میں
اب تو سائے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کو پا کر بھی
کچھ گنوائے ہوئے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے سے شرمندہ
سر جھکاتے ہوتے ہیں ہم دونوں

جیسے اک دوسرے کی چاہت کو
اب بھلاتے ہوتے ہیں ہم دونوں

عشق کیسا کہاں کا عہد فراز
گھر بساتے ہوتے ہیں ہم دونوں

○

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کس کو سیراب کرے وہ کسے پیاسا رکھے

عمر بھر کون نبھاتا ہے تعلق اتنا
اے مری جان کے دشمن تجھے اللہ رکھے

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

دل بھی پاگل ہے کہ اس شخص سے وابستہ ہے
جو کسی اور کا ہونے دے نہ اپنا رکھے

کم نہیں طمعِ عبادت بھی تو حرصِ زر سے
فقر تو وہ ہے کہ جو دین نہ دنیا رکھے

ہنس نہ اتنا بھی فقیروں کے اکیلے پن پر
جا، خدا میری طرح تجھ کو بھی تنہا رکھے

یہ قناعت ہے اطاعت ہے کہ چاہت ہے فراز
ہم تو راضی ہیں وہ جس حال میں جیسا رکھے

○

کسی دل سے بابِ قبول تک جو مسافتیں ہیں دعاؤں کی
یہ لب و کلام کا عجز ہے کہ رعونتیں ہیں خداؤں کی

کبھی شہر جاؤ تو دیکھنا کسی بیسوا کی دکان پر
کئی شعر میری بیاض کے کئی لعبتیں مرے گاؤں کی

تجھے دوسروں سے ملا ہے یہ مری جستجو کا صلہ ہے یہ
ترے تخت و تاج سے قیمتی ہے یہ گرد میرے کھڑاؤں کی

یہ عجیب قریۂ بے اماں مری جاں حذر کہ یہاں وہاں
جہاں دوستوں کے ہیں سائباں وہیں ٹولیاں ہیں بلاؤں کی

نہ مزاج ابرِ کرم کا ہے نہ علاج بارشِ غم کا ہے
تری دوستی کو میں کیا کروں جو نہ دھوپ کی ہے نہ چھاؤں کی

مرے کجکلاہِ کشیدہ سر تُو حریمِ دل میں خرام کر
یہ دیار ہے تری سلطنت یہ زمین ہے ترے ناؤں کی

ہے سمندروں کے سفر کی دھن تو فراز سُن کہ ابھی نہیں
یہ جو چال موجِ بلا کی ہے یہ جو نیتیں ہیں ہواؤں کی

○

طنابِ خیمہ نہ موجِ بلا سے ڈر کر کھینچ
اگر حباب ہے آغوش میں سمندر کھینچ

مرے حریف کھلے دل سے اب شکست بھی مان
نہ یہ کہ فرطِ ندامت سے منہ پہ چادر کھینچ

مبادا کل کسی بسمل پہ رحم آ جائے
کچھ اور روز ابھی تیغِ ناز ہم پر کھینچ

وہ حرف لکھ کہ بیاضِ سخن لہو سے سجے
قلم سے دشنہ کی صورت لکیر دل پر کھینچ

ہیں منفعل مرے قامت سے تیری دیواریں
حصار تو مرے قد کاٹھ کے برابر کھینچ

نہیں تو اس کے تغافل کا کیا گلہ کرنا
جو حوصلہ ہے تو دامانِ یار بڑھ کر کھینچ

کہ شاعری بھی تو جزوِ پیمبری ہے فراز
سو رنجِ خلقِ خدا صورتِ پیمبر کھینچ

غنیم سے

مرے تن کے زخم نہ گن ابھی
مری آنکھ میں ابھی نور ہے
مرے بازوؤں پہ نگاہ کر
جو غرور تھا وہ غرور ہے

ابھی تازہ دم ہے مرا فرس
نئے معرکوں پہ تُلا ہوا
ابھی رزم گاہ کے درمیاں
ہے مرا نشان کھلا ہوا

تری چشمِ بد سے رہیں نہاں
وہ تہیں جو ہیں مری ذات کی
مجھے دیکھ قبضۂ تیغ پر
ہے گرفت ابھی مرے ہاتھ کی

وہ جو دشتِ جاں کو چمن کرے
یہ شرف تو میرے لہو کا ہے
مجھے زندگی سے عزیز تر
یہ جو کھیل تیغ و گلو کا ہے

تجھے مان جوشن و گُرز پر
مرا حرفِ حق مری ڈھال ہے
ترا جور و ظلم بلا سہی
مرا حوصلہ بھی کمال ہے

میں اسی قبیلے کا فرد ہوں
جسے ناز صدق و یقیں پہ ہے
یہی نامہ بر ہے بہار کا
جو گلاب میری جبیں پہ ہے

اب وہ کہتے ہیں

اب وہ کہتے ہیں تم کوئی چارہ کرو
جب کوئی عہد و پیماں سلامت نہیں
اب کسی کنج میں بے اماں شہر کی
کوئی دل کوئی داماں سلامت نہیں

تم نے دیکھا ہے سر سبز پیڑوں پہ اب
سارے برگ و ثمر خار و خس ہو گئے
اب کہاں خوبصورت پرندوں کی رُت
جو نشیمن تھے اب وہ قفس ہو گئے

صحنِ گلزار خاشاک کا ڈھیر ہے
اب درختوں کے تن پر قبائیں کہاں
سرو و شمشاد سے قمریاں اُڑ گئیں
شاخِ زیتون پر فاختائیں کہاں

شیخ منبر پہ نا معتبر ہو چکا
رند بدنام کوئے خرابات میں
فاصلہ ہو تو ہو فرق کچھ بھی نہیں
فتوہ۔ دیں میں اور کفر کی بات میں

اب تو سب راز داں ہمنوا نامہ بر
کوئے جاناں کے سب آشنا جا چکے
کوئی زندہ گواہی بچی ہی نہیں
سب گنہگار۔ سب پارسا جا چکے

اب کوئی کس طرح قُم بہ اذنی کہے
اب کہ جب شہر کا شہر سنسان ہے
حرفِ عیسیٰ نہ صورِ سرافیل ہے
حشر کا دن قیامت کا میدان ہے

مرگِ انبوہ بھی جشن ساماں نہیں
اب کوئی قتل گاہوں میں جائے تو کیا
کب سے توقیرِ لالہ قبائی گئی
کوئی اپنے لہو میں نہائے تو کیا

○

ہجرِ جاناں کی گھڑی اچھی لگی
اب کے تنہائی بڑی اچھی لگی

قریۂ جاں پر اداسی کی طرح
دھند کی چادر پڑی اچھی لگی

ایک تنہا فاختہ اُڑتی ہوئی
اک ہرن کی چوکڑی اچھی لگی

زندگی کی گھپ اندھیری رات میں
یاد کی اک پھلجھڑی اچھی لگی

شہرِ دل اور اتنے لوگوں کا ہجوم
وہ الگ سب سے کھڑی اچھی لگی

ایک شہزادی مگر دل کی فقیر
اس کو میری جھونپڑی اچھی لگی

دل میں آ بیٹھی غزل سی وہ غزال
یہ تصوّر کی گھڑی اچھی لگی

تیرا دکھ، اپنی وفا، کارِ جہاں
جو بھی شے مہنگی پڑی اچھی لگی

آنکھ بھی برسی بہت بادل کے ساتھ
اب کے ساون کی جھڑی اچھی لگی

یہ غزل مجھ کو پسند آئی فراز
یہ غزل اس کو بڑی اچھی لگی

○

ہوئے جاتے ہیں کیوں غمخوار قاتل
نہ تھے اتنے بھی دل آزار قاتل

مسیحاؤں کو جب آواز دی ہے
پلٹ کر آ گئے ہر بار قاتل

ہمیشہ سے ہلاک اک دوسرے کے
مرا سر اور تری تلوار قاتل

تری آنکھوں کو جاناں کیا ہوا ہے
کبھی دیکھے نہ تھے بیمار قاتل

وہاں کیا داد خواہی کیا گواہی
جہاں ہوں منصفوں کے یار قاتل

فراز اس دشمنِ جاں سے گلہ کیا
ہمیشہ سے رہے دلدار قاتل

○

فراق و وصل کیا ہیں عاشقی کے تجربے ہیں
مگر اس سے زیادہ زندگی کے تجربے ہیں

وفا کارِ زیاں بربادی۔ جاں مرگ ساماں
ہمارے ہی نہیں شائد سبھی کے تجربے ہیں

کوئی ست گر سرِ کہسار بیٹھا تیشہ زن ہے
یہ ہم کیا ہیں، یہ تم کیا ہو، اسی کے تجربے ہیں

تری ہیروں سی آنکھیں اور ترے یاقوت سے لب
کسی انساں کے چہرے پر کسی کے تجربے ہیں

وہی ہیں شعر جاناں جو تری چاہت میں لکھے
کہ باقی جو بھی ہیں سب شاعری کے تجربے ہیں

فراز اس کو کوئی قاتل کہے کوئی مسیحا
جدا اک دوسرے سے ہر کسی کے تجربے ہیں

○

نئے سفر میں ابھی ایک نقص باقی ہے
جو شخص ساتھ نہیں اس کا عکس باقی ہے

اٹھا کے لے گئے دزدانِ شب چراغ تلک
سو، کور چشم پتنگوں کا رقص باقی ہے

گھٹا اٹھی ہے مگر ٹوٹ کر نہیں برسی
ہوا چلی ہے مگر پھر بھی حبس باقی ہے

الٹ پلٹ گئی دنیا وہ زلزلے آئے
مگر خرابۂ دل میں وہ شخص باقی ہے

فراز آئے ہو تم اب رفیقِ شب کو لیے
کہ دورِ جام نہ ہنگامِ رقص باقی ہے

○

تجھ پر بھی نہ ہو گماں میرا
اتنا بھی کہا نہ مان میرا

میں دکھتے ہوئے دلوں کا عیسیٰ
اور جسم لہو لہان میرا

کچھ روشنی شہر کو ملی تو
جلتا ہے جلے مکان میرا

یہ ذات یہ کائنات کیا ہے
تو جان مری جہان میرا

تو آیا تو کب پلٹ کے آیا
جب ٹوٹ چکا تھا مان میرا

جو کچھ بھی ہوا یہی بہت ہے
تجھ کو بھی رہا ہے دھیان میرا

○

اک شب تھا وہ میہمان میرا
کچھ اور ہی تھا جہان میرا

تھے صحن میں خوشبوؤں کے خیمے
تھا رشکِ چمن مکان میرا

وہ شاخِ گلاب اور اس پر
ہر پھول تھا ترجمان میرا

وہ چاند تھا میرے بازوؤں میں
آغوش تھا آسمان میرا

یاد آتا ہے اب بھی اس کا کہنا
"میرا شاعر پٹھان میرا"

احمد سے فراز ہو چکا ہوں
پر خوش نہیں خاندان میرا

کالی دیوار

کل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سارے جگ میں جس کی جے جے کار

ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سج دھج سچ مچ دلداروں کی مثل

روشنیوں کے رنگ بھیں یوں رستہ نظر نہ آئے
من کی آنکھوں والا بھی یاں اندھا ہو ہو جائے

بالا بام چراغاں رستے روپ بھرے بازار
جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خوابوں کا سنسار

ایک سفید حویلی جس میں بہت بڑی سرکار
یہیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار

یہیں پہ جادوگر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے
ہر بستی ناگاساکی، ہیروشیما بن جائے

اسی حویلی سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار
لوگوں کی وہ بھیڑ لگی تھی چلنا تھا دشوار

اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے ہزاروں نام
ان ناموں کے بیچ لکھا تھا "شہدائے ویتنام"

دور دور سے جمع ہوئے تھے طرح طرح کے لوگ
آنکھوں آنکھوں ویرانی تھی چہروں چہروں سوگ

بیکل بہنیں گھائل مائیں کرلاتی بیوائیں
ساجن تم کس دیس سدھارے پوچھیں محبوبائیں

اپنے پیاروں دلداروں کا اوجھل مکھڑا ڈھونڈیں
اس کالی دیوار پہ ان کے نام کا ٹکڑا ڈھونڈیں

دلوں میں غم پلکوں پر شبنم ہاتھوں میں پھول اٹھائے
اس ناموں کے قبرستان کا بھید کوئی کیا پائے

نا تربت نا کتبہ کوئی نا ہڈی نا ماس
پھر بھی پاگل نیناں کو تھی پیا ملن کی آس

کہیں کہیں دیوار پہ چسپاں ایک سفید گلاب
جیسے ماں کا کوئی آنسو جیسے باپ کا خواب

سبھی کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکے ایک سوال
کس کارن مٹی میں ملائے ہیروں جیسے لال

پہلے دیس پہ ہم نے کیا کیا اندھیارے برسائے
اس کے جیالے تو کٹ مر کر روشنیاں لے آئے

لیکن اتنے چاند گنوا کر ہم نے بھلا کیا پایا
ہم بد قسمت ایسے جن کو دھوپ ملی نا چھایا

کتنے موتی دے کر حاصل کی یہ کالی دیوار
یہ کالی دیوار جو بس ہے اک خالی دیوار

یہ کالی دیوار جو ہے ناموں کا قبرستان
واشنگٹن کے شہر میں دفن ہیں کس کس کے ارمان

بنگلہ دیش

(ڈھاکہ میوزیم دیکھ کر)

کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی
مرے ہی لوگ تھے میرے ہی دست و بازو تھے
میں جس دیار میں بے یار و بے رفیق پھروں
یہاں کے سارے صنم میرے آشنا رُو تھے

کسے خبر تھی کہ عمروں کی عاشقی کا مآل
دلِ شکستہ و چشم پُر آب جیسا تھا
کسے خبر تھی کہ اس دجلۂ محبت میں
ہمارا ساتھ بھی موج و حباب جیسا تھا

خبر نہیں یہ رقابت تھی نا خداؤں کی
کہ یہ سیاستِ درباں کی چال تھی کوئی
دو نیم ٹوٹ کے ایسی ہوئی زمیں جیسے
مری اکائی بھی خواب و خیال تھی کوئی

یہ میوزیم تو ہے اس روزِ بد کا آئینہ
جو نفرتوں کی تہوں کا حساب رکھتا ہے
کہیں لگا ہوا انبارِ استخواں تو کہیں
لہو میں ڈوبا ہوا آفتاب رکھتا ہے

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن
عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں
مرے خدا مری بینائی چھین لے مجھ سے
میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمتِ یاراں

میں سر جھکائے ہوئے درد کو چھپائے ہوئے
پلٹ کے آیا تو ہر رہگزر اندھیری تھی
میں سوچتا ہوں ابھی تو چراغ روشن تھے
کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی

○

کسی جانب سے بھی پرچم نہ لہو کا نکلا
اب کے موسم میں بھی عالم وہی ہُو کا نکلا

دستِ قاتل سے کچھ امیدِ شفا تھی، لیکن
نوکِ خنجر سے بھی کانٹا نہ گلو کا نکلا

عشق الزام لگاتا تھا ہوس پر کیا کیا
یہ منافق بھی ترے وصل کا بھوکا نکلا

جی نہیں چاہتا میخانے کو جائیں ، جب سے
شیخ بھی بزم نشیں اہلِ سبو کا نکلا

دل کو ہم چھوڑ کے دنیا کی طرف آئے تھے
یہ شبستاں بھی اسی غالیہ مُو کا نکلا

ہم عبث سوزن و رشتہ لیے گلیوں میں پھرے
کسی دل میں نہ کوئی کام رفو کا نکلا

یارِ بے فیض سے کیوں ہم کو توقع تھی فراز
جو نہ اپنا نہ ہمارا نہ عدو کا نکلا

○

غم رگ و پے میں نہیں جب سے شرارے کی مثال
شاعری روٹھ گئی ہے کسی پیارے کی مثال

جانے کب آئے نظر مصرعہ۔ تر کی صورت
جانے کب سانس چلے سینے میں آرے کی مثال

جانے کب ہاتھ لگے یاد کا موتی کوئی
جانے کب لفظ سجے نام تمہارے کی مثال

بے سبب کیسے طبیعت ہو سخن پر مائل
کوئی ترغیب، تو ہو تیرے اشارے کی مثال

غمِ دنیا تو وہ قلزم ہے کہ دل کا مضمون
غرق ہوتا چلا جاتا ہے کنارے کی مثال

ہم بھی کیا ہیں کہ وہاں دل کی دوا پوچھتے ہیں
چارہ گر بھی ہو جہاں درد کے مارے کی مثال

ہم کہاں جائیں جہاں تجھ سے ستمگر نہ ملیں
اب تو ہر شہر ہُوا شہر تمہارے کی مثال

○

ہونٹ ہیروں سے نہ چہرہ ہے ستارے کی مثال
پھر بھی لاوے تو کوئی دوست ہمارے کی مثال

مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہو
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

زندگی اوڑھ کے بیٹھی تھی ردائے شبِ غم
تیرا غم ٹانک دیا ہم نے ستارے کی مثال

عاشقی کو بھی ہوس پیشہ تجارت جانیں
وصل ہے نفع تو ہجراں ہے خسارے کی مثال

ہم کبھی ٹوٹ کے روئے نہ کبھی کھل کے ہنسے
رات شبنم کی طرح صبح ستارے کی مثال

ناسپاسی کی بھی حد ہے جو یہ کہتے ہو فراز
زندگی ہم نے گزاری ہے گزارے کی مثال

○

دوستو یوں بھی نہ رکھو خُم و پیمانہ کُھلے
چند ہی روز ہوئے ہیں ابھی میخانہ کُھلے

اک ذرا رنگ پہ آئے تو سہی جوشِ بہار
اک ذرا ڈھنگ کا موسم ہو تو دیوانہ کُھلے

روئے دلبر کی طرح ابر سے جھلکے مہتاب
کاکلِ شب کی طرح گیسوئے جانانہ کُھلے

جس کے ہجراں میں کتابوں پہ کتابیں لکھ دیں
اس پہ گر حال ہمارا نہیں کھلتا نہ کُھلے

مہرباں ایسی ہے تنہائی کہ پل بھر کے لیے
چشم بستہ ہو تو یادوں کا پری خانہ کھلے

ہم تو سچ مچ کے ہی کردار سمجھ بیٹھے تھے
لوگ آخر کو کہیں صورتِ افسانہ کھلے

جانے یہ پیار سکھاتے ہیں کہ انکار فراز
ہم پہ بت خانہ و کعبہ و کلیسا نہ کھلے

من و تُو

قصیدہ

معاف کر مری مستی خدائے عزّ و جل
کہ میرے ہاتھ میں ساغر ہے میرے لب پہ غزل

کریم ہے تو مری لغزشوں کو پیار سے دیکھ
رحیم ہے تو سزا و جزا کی حد سے نکل

ہے دوستی تو مجھے اذنِ میزبانی دے
تُو آسماں سے اتر اور مری زمین پہ چل

میں پا بہ گِل ہوں مگر چھُو چکا منارۂ عرش
سو تُو بھی دیکھ یہ خاک و خشارہ و جنگل

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ خاکداں میرا
یہ کوہسار یہ قلزم یہ دشت یہ دلدل

مرے جہاں میں زمان و مکان و لیل و نہار
ترے جہاں میں ازل ہے ابد نہ آج نہ کل

مرے لہو میں ہے برقِ تپاں کا جذب و گریز
ترے سبو میں مئے زندگی نہ زہرِ اجل

تری بہشت ہے دشتِ جمود و بحرِ سکوت
مری سرشت ہے آشوبِ ذات سے بیکل

تُو اپنے عرش پہ شاداں ہے سو خوشی تیری
میں اپنے فرش پہ نازاں ہوں اے نگارِ ازل

مجھے نہ جنتِ گم گشتہ کی بشارت دے
کہ مجھ کو یاد ابھی تک ہے ہجرتِ اوّل

ترے کرم سے یہاں بھی مجھے میسّر ہے
جو زاہدوں کی عبادت میں ڈالتا ہے خلل

وہ سیر چشم ہوں، میرے لئے ہے بے وقعت
جمالِ حور و شرابِ طہور و شیر و عسل

گناہگار تو ہوں پر نہ اسقدر کہ مجھے
صلیب روزِ مکافات کی لگے بوجھل

کہیں کہیں کوئی لالہ کہیں کہیں کوئی داغ
مری بیاض کی صورت ہے میری فردِ عمل

وہ تُو کہ عقدہ کشا و مسب الاسباب
یہ میں کہ آپ معمہ ہوں آپ اپنا ہی حل

میں آپ اپنا ہی ہابیل اپنا ہی قابیل
مری ہی ذات ہے مقتول و قاتل و مقتل

برس برس کی طرح تھا نفس نفس میرا
صدی صدی کی طرح کاٹتا رہا پل پل

ترا وجود ہے لاریب اشرف و اعلیٰ
جو سچ کہوں تو نہیں میں بھی ارزل و اسفل

یہ واقعہ ہے کہ شاعر وہ دیکھ سکتا ہے
رہے جو تیرے فرشتوں کی آنکھ سے اوجھل

وہ پرفشاں ہیں مگر غولِ شپّرک کی طرح
سو رائیگاں ہیں کہ جوں چشمِ کور میں کاجل

مرے لیے تو ہے سو بخششوں کی اک بخشش
قلم جو افسر و طبل و علم سے ہے افضل

یہی قلم ہے کہ جس کی ستارہ سازی سے
دلوں میں جوت جگاتی ہے عشق کی مشعل

یہی قلم ہے جو دُکھ کی رُتوں میں بخشتا ہے
دلوں کو پیار کا مرہم سکون کا صندل

یہی قلم ہے کہ اعجازِ حرف سے جس کے
تمام عشوہ طرازانِ شہر ہیں پاگل

یہی قلم ہے کہ جس نے مجھے یہ درس دیا
کہ سنگ و خشت کی زد پر رہیں گے شیش محل

یہی قلم ہے کہ جس کی صریر کے آگے
ہیں سرمہ در گلو خونخوار لشکروں کے بگل

یہی قلم ہے کہ جس کے ہنر سے نکلے ہیں
رہِ حیات کے خم ہوں کہ زلفِ یار کے بل

یہی قلم ہے کہ جس کی عطا سے مجھ کو ملے
یہ چاہتوں کے شگوفے محبتوں کے کنول

تمام سینہ فگاروں کو یاد میرے سخن
ہر ایک غیرتِ مریم کے لب پہ میری غزل

اسی نے سہل کئے مجھ پہ زندگی کے عذاب
وہ عہدِ سنگ زنی تھا کہ دورِ تیغِ اجل

اسی نے مجھ کو سجھائی ہے راہِ اہل صفا
اسی نے مجھ سے کہا ہے پلِ صراط پہ چل

اسی نے مجھ کو چٹانوں کے حوصلے بخشے
وہ کربلائے فنا تھی کہ کارگاہِ جدل

اسی نے مجھ سے کہا اسمِ اہلِ صدق امر
اسی نے مجھ سے کہا سچ کا فیصلہ ہے اٹل

اسی کے فیض سے آتشکدے ہوئے گلزار
اسی کے لطف سے ہر زشت بن گیا اجمل

اسی نے مجھ سے کہا جو ملا بہت کچھ ہے
اسی نے مجھ سے کہا جو نہیں ہے ہاتھ نہ مل

اسی نے مجھ کو قناعت کا بوریا بخشا
اسی کے ہاتھ سے دستِ درازِ طمع ہے شل

اسی کی آگ سے میرا وجود روشن ہے
اسی کی آب سے میرا ضمیر ہے صیقل

اسی نے مجھ سے کہا بیعتِ یزید نہ کر
اسی نے مجھ سے کہا مسلکِ حسینؓ پہ چل

اسی نے مجھ سے کہا زہر کا پیالہ اٹھا
اسی نے مجھ سے کہا، جو کہا ہے اس سے نہ ٹل

اسی نے مجھ سے کہا عاجزی سے مات نہ کھا
اسی نے مجھ سے کہا مصلحت کی چال نہ چل

اسی نے مجھ سے کہا غیرتِ سخن کو نہ بیچ
کہ خونِ دل کے شرف کو نہ اشرفی سے بدل

اسی نے مجھ کو عنایت کیا یدِ بیضا
اسی نے مجھ سے کہا سحرِ سامری سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا عقل تہہ نشینی ہے
اسی نے مجھ سے کہا ورطۂ خرد سے نکل

اسی نے مجھ سے کہا وضعِ عاشقی کو نہ چھوڑ
وہ خواہ عجز کا لمحہ ہو یا غرور کا پل

اذیتوں میں بھی بخشی مجھے وہ نعمتِ صبر
کہ میرے دل میں گرہ ہے نہ میرے ماتھے پہ بل

ہیں ثبت سینۂ مہتاب پر قدم میرے
ہیں منتظر میرے مریخ و مشتری و زحل

تری عطا کے سبب یا مری انا کے سبب
کسی دعا کا ہے موقع نہ التجا کا محل

سو تجھ سا ہے کوئی خالق نہ مجھ سی ہے مخلوق
نہ کوئی تیرا ہے ثانی نہ کوئی میرا بدل

فراز تو بھی جنوں میں کدھر گیا ہے نکل
ترا دیارِ محبت، تری نگارِ غزل

ق

ٹپک چکا ہے بہت تیری آنکھ سے خونناب
برس چکا ہے بہت تیرے درد کا بادل

کچھ اور دیر ابھی حسرتِ وصال میں رہ
کچھ اور دیر ابھی آتشِ فراق میں جل

کسی بہار شمائل کی بات کر کہ بنے
ہر ایک حرف شگوفہ ہر ایک لفظ کنول

○

تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
تُو مری پہلی محبت تھی مری آخری دوست

لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
یہ تو دنیا ہے مری جاں کئی دشمن کئی دوست

تیرے قامت سے بھی لپٹی ہے امر بیل کوئی
میری چاہت کو بھی دنیا کی نظر کھا گئی دوست

یاد آئی ہے تو پھر ٹوٹ کے یاد آئی ہے
کوئی گزری ہوئی منزل کوئی بھولی ہوئی دوست

اب بھی آتے ہو تو احسان تمہارا لیکن،
وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست

تیرے لہجے کی تھکن میں ترا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست

بارشِ سنگ کا موسم ہے مرے شہر میں تو
تُو یہ شیشے سا بدن لے کے کہاں آ گئی دوست

میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط "آپ کی دوست"

○

تمام بزم تھی مشتاقِ حرف بابتِ دوست
سو میں نے اور بڑھا دی ذرا حکایتِ دوست

وفا تو اپنے سے ہوتی ہے دوسرے سے نہیں
سو اس بنا پہ کوئی کیا کرے شکایتِ دوست

یہ لوگ سرو و صنوبر کا ذکر کرتے ہیں
یہ استعارے نہیں حسبِ قدّوقامتِ دوست

وہ بے نیاز بھی ہو گا مگر یہ بات سمجھ
ہر ایک عرض نہیں درخورِ سماعتِ دوست

ادھر ادھر نہ یونہی زندگی لٹاتے پھرو
کہ صرف دل ہی نہیں جاں بھی ہے امانتِ دوست

تمام وار کسی ایک مہرباں کے نہیں
کوئی ہے بخششِ دنیا کوئی عنایتِ دوست

تمہی بتاؤ کہ طے کس طرح کرو گے فراز
یہ عمر بھر کا سفر اور بے رفاقتِ دوست

○

فقط ہنر ہی نہیں عیب بھی کمال کے رکھ
سو دوسروں کے لیے تجربے مثال کے رکھ

نہیں ہے تاب تو پھر عاشقی کی راہ نہ چل
یہ کارزارِ جنوں ہے جگر نکال کے رکھ

سبھی کے ہاتھ دلوں پر نگاہ تجھ پر ہے
قدح بدست ہے ساقی قدم سنبھال کے رکھ

فریب سے نہ مجھے صید کر وقار سے کر
سو اسقدر بھی نہ دانہ قریب جال کے رکھ

فراز بھول بھی جا سانحے محبت کے
ہتھیلیوں پہ نہ اِن آبلوں کو پال کے رکھ

○

شبِ نشاط تھی یا صبحِ پُر ملال تھی وہ
تھکن سے چُور تھا میں نیند سے نڈھال تھی وہ

میں اس کی ہمسفری میں بھی دل گرفتہ رہا
کہ ہر قدم پہ جدائی کا احتمال تھی وہ

ادھر ادھر کے بھی کردار آتے جاتے رہے
مرے سخن کا مگر مرکزی خیال تھی وہ

وہ پیرہن تھی مگر جسم و جاں رہی میری
کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسبِ حال تھی وہ

تمام عمر اگر زندگی نے زخم دیئے
تمام عمر کے زخموں کا اندمال تھی وہ

یہ عمر بھر کا اثاثہ اسی کے نام تو ہے
اگرچہ میری رفاقت میں چند سال تھی وہ

فرازؔ یاد ہے اب تک سپردگی اس کی
ز فرق تا بقدم خواہشِ وصال تھی وہ

○

تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کا ہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو نباھے تو میں ہوں

دل نے کب شیوہ۔ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پر نہ ہوا میں سرِ راھے تو میں ہوں

جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشان نگاہے تو میں ہوں

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار ! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فراز
صاحبِ خرقہ وہ پیوند کلاہے تو میں ہوں

خوابوں کے بیوپاری

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
ہم راکھ لیے ہیں جھولی میں
اور سر پہ ہے ساہوکار کھڑا

یاں بوند نہیں ہے ڈیوے میں
وہ باج بیاج کی بات کرے
ہم بانجھ زمین کو تکتے ہیں
وہ ڈھور اناج کی بات کرے
ہم کچھ دن کی مہلت مانگیں
وہ آج ہی آج کی بات کرے

جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُر سنگیت میں سوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے

کچھ خواب سجل مُسکانوں کے
کچھ بول کبت دیوانوں کے
کچھ لفظ جنہیں معنی نہ ملے
کچھ گیت شکستہ جانوں کے
کچھ نیر وفا کی شمعوں کے
کچھ پر پاگل پروانوں کے

پھر اپنی گھائل آنکھوں سے
خوش ہو کے لہو چھڑکایا تھا
ماٹی میں ماس کی کھاد بھری
اور نس نس کو زخمایا تھا
اور بھول گئے پچھلی رُت میں
کیا کھویا تھا کیا پایا تھا

ہر بار گگن نے وہم دیا
اب کے برکھا جب آئے گی
ہر بیج سے کونپل پھوٹے گی
اور ہر کونپل پھل لائے گی
سر پر چھایا چھتری ہو گی
اور دھوپ گھٹا بن جائے گی

جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
کچھ زخمی خواب تھے کانٹوں پر
کچھ خاکستر سے کجرے تھے
اور دور افق کے ساگر میں
کچھ ڈولتے ڈوبتے بجرے تھے

اب پاؤں کھڑاؤں دھول بھری
اور جسم پہ جوگ کا چولا ہے
سب سنگی ساتھی بھید بھرے
کوئی ماسہ ہے کوئی تولا ہے
اس تاک میں یہ اس گھات میں وہ
ہر اور ٹھگوں کا ٹولا ہے

اب گھاٹ نہ گھر دہلیز نہ در
اب پاس رہا ہے کیا بابا
بس تن کی گٹھڑی باقی ہے
جا یہ بھی تُو لے جا بابا
ہم بستی چھوڑے جاتے ہیں
تو اپنا قرض چکا بابا

○

دُکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں
دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

بے طرح حالِ دل ہے اور تجھ سے
دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

ایک تُو حرف آشنا تھا مگر
اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

قاصدا ! ہم فقیر لوگوں کا
اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اے خدا دردِ دل ہے بخششِ دوست
آب و دانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں

اب تو اپنا بھی اس گلی میں فرازؔ
آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

○

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل جانے کیا سے کیا ہو جائیں

تو کہ یکتا تھا بے شمار ہوا
ہم بھی ٹوٹیں تو جا بجا ہو جائیں

ہم بھی مجبوریوں کا عذر کریں
پھر کہیں اور مبتلا ہو جائیں

ہم اگر منزلیں نہ بن پائے
منزلوں تک کا راستا ہو جائیں

دیر سے سوچ میں ہیں پروانے
راکھ ہو جائیں یا ہوا ہو جائیں

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

اب کے گر تُو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

وہ تری طرح کوئی تھی

یونہی دوش پر سنبھالے
گھنی زلف کے دوشالے
وہی سانولی سی رنگت
وہی نین نیند والے

وہی من پسند قامت
وہی خوشنما سراپا
جو بدن میں نیم خوابی
تو لہو میں رتجگا سا

کبھی پیاس کا سمندر
کبھی آس کا جزیرہ
وہی مہربان لہجہ
وہی میزباں وطیرہ

تجھے شاعری سے رغبت
اسے شعر یاد میرے
وہی اس کے بھی قرینے
جو ہیں خاص وصف تیرے

کسی اور ہی سفر میں
سرِ راہ مل گئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی

کسی شہرِ بے اماں میں
میں وطن بدر اکیلا
کبھی موت کا سفر تھا
کبھی زندگی سے کھیلا

مرا جسم جل رہا تھا
وہ گھٹا کا سائباں تھی
میں رفاقتوں کا مارا
وہ مری مزاج داں تھی

مجھے دل سے اس نے پوجا
اسے جاں سے میں نے چاہا
اِسی ہمرہی میں آخر
کہیں آگیا دوراہا

یہاں گمرہی کے امکاں
اسے رنگ و بو کا لپکا
یہاں لغزشوں کے ساماں
اسے خواہشوں نے تھپکا

یہاں دام تھے ہزاروں
یہاں ہر طرف قفس تھے
کہیں زر زمیں کا دلدل
کہیں جال تھے ہوس کے

وہ فضا کی فاختہ تھی
وہ ہوا کی راج پتری
کسی گھاٹ کو نہ دیکھا
کسی جھیل پر نہ اُتری

پھر اک ایسی شام آئی
کہ وہ شام آخری تھی
کوئی زلزلہ سا آیا
کوئی برق سی گری تھی

عجب آندھیاں چلیں پھر
کہ بکھر گئے دل و جاں
نہ کہیں گلِ وفا تھا
نہ چراغِ عہد و پیماں

وہ جہاز اتر گیا تھا
یہ جہاز اتر رہا ہے
تری آنکھ میں ہیں آنسو
مرا دل بکھر رہا ہے

تُو جہاں مجھے ملی ہے
وہ یہیں جدا ہوئی تھی
تجھے اور کیا بتاؤں
وہ تری طرح کوئی تھی

○

چمن میں نغمہ سرائی کے بعد یاد آئے
قفس کے دوست رہائی کے بعد یاد آئے

وہ جن کو ہم تیری قربت میں بھول بیٹھے تھے
وہ لوگ تیری جدائی کے بعد یاد آئے

وہ شعر یوسفِ کنعاں تھے جن کو بیچ دیا
ہمیں قلم کی کمائی کے بعد یاد آئے

حریم ناز کے خیرات بانٹنے والے
ہر ایک در کی گدائی کے بعد یاد آئے

ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں تھے جانِ فراز
کہ تجھ کو ساری خدائی کے بعد یاد آئے

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں

برس یا دو برس کی قید تنہائی بھی گر ہوتی
تو پھر بھی زندگی لاچار ہو جاتی
محبت بے وفا اور دوستی بیزار ہو جاتی
مگر تم نے تو سارے ہجر کے بیمار موسم
بیکلی بیچارگی اور کرب کے
بوسیدہ بستر پر گزارے ہیں
سرِ بالیں
کسی کے ہاتھ میں چارہ گری کی شمعِ لرزاں
اور نہ آوازوں کے روشن داں
نشاطِ خواب کیا
جب وا رہے دروازۂ مژگاں

یہ دکھ آساں نہ تھے جاناں
پرانی داستانوں میں تو ہوتا تھا
کہ کوئی شاہزادی یا کوئی نیلم پری
دیووں یا آسیبوں کی قیدی
اپنے آدم زاد دیوانے کی رہ تکتے
شبیہِ سنگ ہو جاتی
مگر وہ داستانیں تھیں
پھر ان میں بھی تو آخر کار
اس کا باوفا ساونت شہزادہ
سمندر پار کرتا
وار کرتا
کوہساروں کے جسد مسمار کرتا
ان طلسماتی حصاروں سے اسے آزاد کر کے
ساتھ لے جاتا

مگر تُو داستانوں کا کوئی کردار
یا پارینہ قصوں کا کوئی حصہ نہ تھی

تُو نے تو خود آزارگی اپنے تئیں ہی منتخب کی تھی
کئی دن پھر کئی دن پھر نئے دن
پھر کئی راتیں کئی راتیں نئی راتیں
بدن کا دوزخی سیال ایندھن
اور لہو کا آتشیں لاوا
رگوں میں دوڑنے پھرنے کا پھر قائل نہیں رہتا
تعلق کی چٹانیں ریت بن جاتی ہیں
دلداری کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں
ارماں آنسوؤں کا رزق بن جاتے ہیں
اور دل ایک ہی صورت پہ پھر مائل نہیں رہتا
وفاداری بشرطِ استواری کا چلن
پھر عاشقی کی راہ میں حائل نہیں رہتا
بدل جاتے ہیں خال و خد
پگھل جاتے ہیں جسم و جاں
یہ دکھ آساں نہیں جاناں

○

بہ اندازِ مثنوی۔ قدیم

تم کہ سنتے رہے اوروں کی زبانی لوگو
ہم سناتے ہیں تمہیں اپنی کہانی لوگو

کون تھا دشمن جاں وہ کوئی اپنا تھا کہ غیر
ہاں وہی دشمنِ جاں دلبرِ جانی لوگو

زلف زنجیر تھی ظالم کی تو شمشیر بدن
روپ سا روپ جوانی سی جوانی لوگو

سامنے اس کے دِکھے نرگسِ شہلا بیمار
روبرو اس کے بھرے سرو بھی پانی لوگو

اس کی گفتار میں خندہ تھا شگفتِ گل کا
اس کی رفتار میں چشمے کی روانی لوگو

اس کے ملبوس سے شرمندہ قبائے لالہ
اس کی خوشبو سے جلے رات کی رانی لوگو

ہم جو پاگل تھے تو بے وجہ نہیں تھے پاگل
ایک دنیا تھی مگر اس کی دوانی لوگو

عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے یوں بھی
کب رہا راز کوئی رازِ نہانی لوگو

ایک تو عشق کیا عشق بھی پھر میر سا عشق
اس پہ غالب کی سی آشفتہ بیانی لوگو

حیلہ جُو ویسے بھی ہوتے ہیں زمانے والے
اس پہ آئی نہ ہمیں بات چھپانی لوگو

داستاں کوئی بھی ہو ذکر کسی شخص کا ہو
ہم نے اس نام سے تمہید اٹھانی لوگو

ہاں وہی نام کہ جس نام سے وابستہ ہے
ہر محبت وہ نئی ہو کہ پرانی لوگو

ہم ہی سادہ تھے کیا اس پہ بھروسا کیا کیا
ہم ہی ناداں تھے کہ لوگوں کی نہ مانی لوگو

ہم تو اس کے لیے گھر بار بھی تج بیٹھے تھے
اس ستمگر نے مگر قدر نہ جانی لوگو

کس طرح بھول گیا قول و قسم وہ اپنے
کتنی بے صرفہ گئی یاددہانی لوگو

جس طرح تتلیاں باغوں سے سفر کر جائیں
جیسے الفاظ میں مر جائیں معانی لوگو

اب غزل کوئی اترتی ہے تو نوحے کی طرح
شاعری ہو گئی اب مرثیہ خوانی لوگو

شمع رویوں کی محبت میں یہی ہوتا ہے
رہ گیا داغ فقط دل کی نشانی لوگو

○

عشق نشّہ ہے نہ جادو جو اتر بھی جائے
یہ تو اک سیلِ بلا ہے سو گزر بھی جائے

تلخیِ کام و دہن کب سے عذابِ جاں ہے
اب تو یہ زہر رگ و پے میں اتر بھی جائے

اب کے جس دشتِ تمنا میں قدم رکھا ہے
دل تو کیا چیز ہے امکاں ہے کہ سر بھی جائے

ہم بگولوں کی طرح خاک بسر پھرتے ہیں
پاؤں شل ہوں تو یہ آشوبِ سفر بھی جائے

لٹ چکے عشق میں اک بار تو پھر عشق کرو
کس کو معلوم کہ تقدیر سنور بھی جائے

شہرِ جاناں سے پرے بھی کئی دنیائیں ہیں
ہے کوئی ایسا مسافر جو ادھر بھی جائے

اس قدر قرب کے بعد ایسے جدا ہو جانا
کوئی کم حوصلہ انساں ہو تو مر بھی جائے

ایک مدت سے مقدر ہے غریب الوطنی
کوئی پردیس میں ناخوش ہو تو گھر بھی جائے

○

تُو کس طرح سے یہ احساں مگر اُتارے گا
عطا کرے گا جو دستار، سر اُتارے گا

نہ مانگ ایک بھی لمحہ خوشی کا دنیا سے
یہ قرض وہ ہے جسے عمر بھر اُتارے گا

یہ عمر بھر کی تھکن ایک دن تو اترے گی
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا

یہ لگ رہا ہے ستاروں کی چال سے کہ فلک
کوئی عذاب مری خاک پر اتارے گا

چمن کو زہر سے سینچا ہے باغباں نے فراز
اجل گرفتہ ہی کوئی ثمر اتارے گا

○

میں دھوکا ہوں تُو دھوکا ہے
ترک و طلب ہر دُو دھوکا ہے

تیری ہر مُسکان فریبی
میرا ہر آنسو دھوکا ہے

سارے گل بوٹے مصنوعی
رنگ ، نمو ، خوشبو دھوکا ہے

کون ہے یکتا کون یگانہ
مدحِ رخ و گیسو دھوکا ہے

لافِ محبت ہرزہ سرائی
دلبرِ غالیہ مُو دھوکا ہے

چاکِ جگر اک شعبدہ بازی
اُس پر کارِ رفو دھوکا ہے

مکر ہے عشق کا دیوانہ پن
حسن کا سب جادو دھوکا ہے

نالۂ قمری وہمِ سماعت
سروِ کنارِ جُو دھوکا ہے

رنگِ پرِ طاؤس نمائش
سحرِ رمِ آہو دھوکا ہے

عکس فقط نیرنگ نظر کا
ہر بتِ آئنہ رُو دھوکا ہے

نشّہ کہاں ہے زخم کا مرہم
ساقی و جام و سبو دھوکا ہے

کاوشِ لوح و قلم افسانہ
قصۂ تیغ و گلو دھوکا ہے

کس نے خون کے آنسو روئے
دامن لہو لہو دھوکا ہے

مستوں کی مستی دکھلاوا
صوفی کی یا ہُو دھوکا ہے

مسجد میں بٹ مار ہے ملاّ
مندر میں بھکشو دھوکا ہے

کذب و ریا کی ڈفلی باجے
چیلا جھوٹ، گرو دھوکا ہے

جو پاگل تھے سو پاگل ہیں
حکمت کا دارُو دھوکا ہے

اُتر دکھن پورب پچھم
اس جگ میں ہر سُو دھوکا ہے

○

غنیم سے بھی عداوت میں حد نہیں مانگی
کہ ہار مان لی لیکن مدد نہیں مانگی

ہزار شکر کہ ہم اہلِ حرف زندہ نے
مجاورانِ ادب سے سند نہیں مانگی

بہت ہے لمحہ۔ موجود کا شرف بھی مجھے
سو اپنے فن سے بقائے ابد نہیں مانگی

قبول وہ جسے کرتا وہ التجا نہیں کی
دعا جو وہ نہ کرے مسترد، نہیں مانگی

میں اپنے جامہ۔ صد چاک سے بہت خوش ہوں
کبھی عبا و قبائے خرد نہیں مانگی

"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
جبھی تو گور کنوں سے لحد نہیں مانگی

میں سر برہنہ رہا پھر بھی سر کشیدہ رہا
کبھی کلاہ سے توقیرِ قد نہیں مانگی

عطائے درد میں وہ بھی نہیں تھا دل کا غریب
فراز میں نے بھی بخشش میں حد نہیں مانگی

○

خود سے روٹھوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رو لوں

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

میں کہ اک صبر کا صحرا نظر آتا ہوں تجھے
تُو جو چاہے تو ترے واسطے دریا رو لوں

اور معیار رفاقت کے ہیں ایسا بھی نہیں
جو محبت سے ملے ساتھ اسی کے ہو لوں

خود کو عمروں سے مقفل کیے بیٹھا ہوں فراز
وہ کبھی آئے تو خلوت کدۂ جاں کھولوں

تجھے کیا خبر کہ جاناں

تُو نہ تھی کوئی سرائے
کہ میں رات بھر ٹھہر کے
سفر اختیار کرتا
میں نہ تھا کوئی مسافر
کہ جو گھر نگر کو تج کر
کہیں اور پیار کرتا

انہی بستیوں میں ورنہ
کئی دل کئی نگاہیں
کوئی نیند کا ہو رسیا
تو ہزار خوابگاہیں

کہیں کاکلوں کے بادل،
کہیں قامتوں کی چھاؤں
کہیں شہر آرزو کے
کہیں حسرتوں کے گاؤں

کہیں خلوتیں دکانیں
کہیں جسم بیوپاری
نہ کسی صنم کو شکوہ
نہ دکھی کوئی پجاری

یہ عجب قمار خانے
یہاں ہار بھی کمائی
نہ کسی کا مان ٹوٹا
نہ کسی نے چوٹ کھائی

کوئی بے مآل قصہ
کوئی داستاں ادھوری
یہ سپردگی جدائی
تو وہ اختلاط دوری

یہاں شوق بھی تماشا
یہاں عشق بھی ملامت
نہ تو وصل خوبصورت
نہ فراق ہی قیامت

یہ ضرورتوں کے میلے
یہ قیام کے بہانے
یہ تھکن اتارنے کے
سبھی عارضی ٹھکانے

یہ ہمارے عہد و پیماں
تجھے کیا خبر کہ جاناں
یہ دنوں کی بات کب تھی
یہ رفاقتوں کی صدیاں

یہ جو درد ہے امر ہے
کہ وفا ہے حرفِ آخر
تو نہ تھی کوئی سرائے
نہ میں ہوں کوئی مسافر

○

روزِ روشن بھی ترا لوحِ سیہ بھی تیری
پھر تو یارب مری رودادِ گنہ بھی تیری

ابرِ باراں پہ نہ کر ناز کہ اے دستِ کریم
کشتِ بے دانہ و بے آب و گیہ بھی تیری

امتحاں دل کا نہیں طبل و علم کا ہے تو پھر
جا بہ لشکر بھی ترا تیغ و زرہ بھی تیری

وہ ہمی ہیں کہ تجھے تیر و کماں بخشتے تھے
اور اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں پنہ بھی تیری

واعظا منبر و مسند پہ نہ اترا اتنا
یہ بتا کیا کسی دل میں ہے جگہ بھی تیری

کیا کریں حرص محبت میں بھی در آتی ہے
ورنہ کافی تھی کبھی ایک نگہ بھی تیری

کیا اسی بھول کو کہتے ہیں محبت کا زوال
اب مجھے یاد نہیں سالگرہ بھی تیری

یونہی دو دن کی ملاقات پہ اترا نہ فراز
ہے کہیں یار کی محفل میں جگہ بھی تیری

فراز اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں، انہی کی طرح تڑپتے ہیں مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے، ٹکڑے بکھیرتے نظر آتے ہیں جو ان کے معاشرے کے جسم کو جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کا شعر نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی معیار کا ہے بلکہ ایک شعلہ ہے جو دل سے زبان تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آئے فیض اور ن۔ م راشد کے بعد مگر اساتذۂ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے بعد آنے والوں کو راہ دکھاتا اور متاثر کرتا ہے۔ فراز کا شمار اب ان میں ہے۔

مجروح سلطان پوری